فردوسی سلسلہ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

صوفی سلسلے اور اُن سے متعلق صوفیاء کرام کے کارہائے نمایاں قرون وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صوفی سلسلوں کی داغ بیل اسلام کی کئی صدیاں گذر جانے کے بعد پڑی۔ دسویں صدی عیسوی کے اخیر میں مسلمانوں میں صوفی رجحانات کی نشوونما ہونے لگی تھی اور یہ یقیناً ردعمل تھا مادیت پرستی اور اخلاقی گراوٹ کا جو عباسیوں کے سیاسی زوال شروع ہونے اور دنیائے اسلام میں طوائف الملوکی کے رونما ہونے کے بعد بڑی تیزی سے ابھر رہی تھی۔ ان حالات میں دین دار اور خدا ترس علماء میں دین کے احیاء کے لیے تبلیغ و تربیت کی ضرورت کا احساس پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔ ان علماء میں سے کچھ نے خانقاہی نظام کو اپنا کر رشد و ہدایت کا کام شروع کیا اور پھر جلد ہی مختلف صوفیاء کے سلسلوں کا آغاز ہوا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں غالباً غزنوی خاندان کے حکمراں سلطان رکن الدین ابراہیم کے عہد میں (۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء) شیخ علی ہجویری الملقب بہ داتا گنج بخش لاہور میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے زمانہ تک صوفی سلسلوں کی کوئی باقاعدہ تنظیم وجود میں نہیں آئی تھی اور اسلام میں تصوف کی ابتداء کے متعلق بھی کئی تصورات تھے۔ شیخ علی ہجویری ایک راسخ العقیدہ عالم تھے وہ تصوف کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کرتے ہیں۔ صدیق اکبر کے بعد دوسرے اور تیسرے خلیفہ کا ذکر کرتے ہیں ان کے نزدیک اسلام میں مذہبی اور روحانی روایات کی نمایندگی رسول اللہ کے بعد شیخین فرماتے ہیں، اس لیے ہر صوفی کے لیے سنت اور شیخین کا اتباع کرنا لازم ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے آتے آتے صوفیاء کرام مختلف سلسلوں میں بٹ جاتے ہیں اور

۱؎ شیخ علی ہجویری، کشف المحجوب، اردو ترجمہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری ۱۳۹۳ھ ص ۱۷۵ تا ۱۷۸

زیادہ تر سلسلوں کی ابتدا کی تاریخ شیخ حسن بصری کے توسط سے حضرت علی حیدرؓ سے ملادی جاتی ہے لیکن ایسا ثابت کرنے کے لیے تاریخی شواہد کی کمی ہے۔ بہر حال تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر سلطنت دہلی کے وجود میں آنے کے بعد ہندوستان میں مختلف سلسلوں کے نمائندوں کا ورود ہوا اور اُن کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں میں خانقاہیں اور بعد میں درگاہیں قائم ہوئیں۔ ہندوستان کے نووارد صوفیا میں زیادہ تر مہاجر تھے جو کہ ۱۲۲۰ء میں وسط ایشیا پر چنگیز خاں کی یلغار سے بچکر پناہ لینے یہاں آئے تھے۔

ان مہاجرین میں سہروردی سلسلے کے نامور بزرگ شیخ نجم الدین کبریٰ سے تعلق رکھنے والے صوفیا دہلی میں سب سے پہلے آئے۔ ان میں سے ایک عالم اور صوفی شیخ نجم الدین صغریٰ کو سلطان التتمش نے اُن کے علم، تقویٰ اور اُن کی دیانت داری سے متاثر ہو کر سلطنت دہلی کا شیخ الاسلام بنادیا[1] لیکن سلسلے کی نمائندگی کا کام شیخ بدرالدین سمرقندی کے ذمہ رہا۔ شیخ بدرالدین سمرقندی کے بعد اُن کے خلیفہ اور جانشین شیخ رکن الدین فردوسی کے نام پر اُن کے معتقدین نے اپنے آپ کو فردوسی اور اپنے سلسلے کو سہروردی کے بجائے فردوسی سلسلہ کہنا شروع کیا۔ لہٰذا سہروردی سلسلے کی اس شاخ نے ایک علٰحدہ نئے سلسلے کی شکل اختیار کرلی۔

ہم تاریخی شواہد کی بنا پر ثابت کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں چشتی سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین چشتی سجزی سلطان التتمش کے عہد میں ہندوستان آئے اور اُن کے آنے سے پہلے نجم الدین صغریٰ جو شیخ نجم الدین کبریٰ کے یا ان کے کسی خلیفہ کے مرید تھے، دہلی سلطنت میں شیخ الاسلام کے اہم عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ مناقب الاصفیہ کے اس بیان کی تصدیق چشتی صوفیا کی تالیفات سے بھی ہوتی ہے[2] لیکن سہروردی سلسلے کی اس کبروی شاخ کا یعنی فردوسی سلسلے کا فروغ شیخ بدرالدین

---

[1] مخدوم شعیب فردوسی، مناقب الاصفیہ، کلکتہ ۱۳۱۳ھ ص۸ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مذہبی امور میں سختی کی وجہ سے دوسرے ہمعصر صوفیوں سے نجم الدین صغریٰ کے شدید اختلافات رہے۔ اور کچھ صوفیا کو انھوں نے دہلی سے جلاوطن بھی کر دیا تھا۔ اس وجہ سے چشتی تذکرہ نگاروں نے خاص طور پر میر خورد، مولف سیرالاولیاء نے اُن کی تصویر مسخ کرکے پیش کی ہے۔ مناقب الاصفیہ کے مطابق وہ متقی پرہیز گار بزرگ تھے اور نجم الدین کبریٰ سے عقیدت کی بنا پر ان کو نجم الدین کبریٰ کہا جاتا تھا۔

[2] ملاحظہ کیجئے میرا مقالہ "اردو میں تاریخ نگاری" مجلہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۴۰۵ - ۴۰۶

سمرقندی کی کوششوں کا رہین منت رہا۔

شیخ بدرالدین سمرقندی شیخ سیف الدین باخرزی خلیفہ شیخ نجم الدین کبریٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ بدرالدین سمرقندی کو اپنے پیر کے پیر سے بھی ملاقات کا شرف حاصل تھا دہلی میں قیام پذیر ہونے کے بعد وہ اپنے سلسلے کی ترقی کے لیے اپنی خانقاہ میں گوشہ نشین ہوکر رشد وہدایت کے ذریعہ کام کرتے رہے۔ قرآن وسنت کی سختی سے پابندی کی وجہ سے وہ خواص میں تو مقبول ہوئے لیکن عوام کی توجہ کا کبھی مرکز نہ بن سکے۔ اُن کی روایات اُن کے مرید، خلیفہ اور دہلی میں جانشین شیخ رکن الدین فردوسی نے جن کے نام سے سلسلہ موسوم ہوا، تاحیات قائم رکھا[۱]۔ یہ بزرگ ہر بدعت کے چاہے وہ دوسروں کے نزدیک اچھی ہی کیوں نہ ہو خلاف تھے خاص طور پر شیخ نجم الدین صغریٰ اس معاملہ میں بہت سخت تھے اس معاملہ میں اُن کے دہلی میں چشتی اور دوسرے ممتاز سہروردیوں سے شدید اختلافات رہے ان وجوہ سے ۱۴ ھویں صدی عیسوی کے چشتی تذکرہ نگاروں نے ان بزرگوں سے متعلق عوام اور خواص میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ مثال کے طور پر مشہور روایت ہے اور اس روایت نے بعد میں ایک واقعہ کی شکل اختیار کر لی ہے کہ سلطان التتمش کے عہد میں جب سہروردی صلاحیت اور عظمت کی بنا پر جلد ہی مقبول عام ہو گئے۔ ان کے بڑھتے ہوئے وقار سے دہلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ حسد میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے دہلی کی مشہور رقاصہ سے اُن کے خلاف سازش کی اور اُن پر الزام عائد کیا کہ رقاصہ سے ان کے ناجائز تعلقات تھے۔ سلطان التتمش نے حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے محضر (خصوصی عدالت) طلب کیا۔ محضر میں حکم کے فرائض شیخ بہاء الدین زکریا کے سپرد کیے گئے۔ جب رقاصہ کو طلب کیا گیا تو اس پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اُس نے سازش کو ظاہر کر دیا۔ جب شیخ جلال الدین تبریزی معصوم ثابت ہوئے تو سلطان وقت نے شیخ نجم الدین صغریٰ کو اُن کے عہدہ سے برطرف کر دیا لیکن اس واقعہ سے شیخ جلال الدین تبریزی اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ وہ دہلی چھوڑ کر بداون چلے گئے اور وہاں سے مختصر قیام کے بعد بنگال تشریف لے گئے اور وہاں اسلام کی شمع کو روشن کیا۔ لیکن یہ سب افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نجم الدین صغریٰ نے شیخ جلال الدین تبریزی کو کسی قابلِ اعتراض بات پر

۱؎ ملاحظہ کیجیے میرا مقالہ "اردو میں تاریخ نگاری" مجلہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۴۰۵ - ۴۰۶

جس کا ہمارے ماخذ میں ذکر نہیں ہے دہلی سے بداون کے لیے جلا وطن کر دیا تھا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام کے عہدہ پر باقی رہے۔ اس کے باوجود کچھ عرصہ کے بعد جب شیخ جلال الدین تبریزی کو بداون میں معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی دہلی میں موت ہوگئی ہے تو انھوں نے وہاں غائبانہ طور پر اُن کی نماز جنازہ پڑھی[۱]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے ہمعصر اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے پیر و مرشد اور شیخ رکن الدین فردوسی کے خلیفہ، شیخ نجیب الدین فردوسی اپنے پیشروان طریقت کی طرح راسخ العقیدہ سنّی علماء کی روایات کے سختی سے پابند رہے۔ اُن کا بھی مسلم عوام پر زیادہ اثر نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن وہ خواص میں محترم رہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیا کی وفات کے بعد شیخ شرف الدین منیری ان سے متاثر ہوکر اُن کے مرید بن گئے تھے اور انھوں نے بھی مرید کے علم و فضل اور اُن کی نیکی و تقویٰ کی بنا پر خلافت نامہ عطا کرکے انھیں بہار واپسی کا حکم دیدیا تھا۔ شیخ شرف الدین منیری کے ساتھ سلسلے کا مرکز دہلی سے بہار منتقل ہوگیا۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری جن کو ان کے عقیدت مند مخدوم جہاں کے لقب سے پکارتے تھے عظیم روحانی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اُن سے ان کی بے لوث دینی خدمات کی بنا پر ہندوستان میں فردوسی سلسلے کی مقبولیت اور شہرت کی تاریخ کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ خاندانی روایت کے مطابق وہ بنی ہاشم سے متعلق تھے اور تیرہویں صدی میں اُن کے جدِ امجد بہار کے قصبہ منیر میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق خاندان کے لوگ بحیثیت اشراف کے تحصیل علم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لہٰذا مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم منیر ہی میں ہوئی۔ تعلیم کو مکمل ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ وہاں سے مولانا اشرف الدین توامہ کا دہلی سے سنار گاؤں (بنگال) جاتے ہوئے گذر ہوا۔ مولانا فقہ، حدیث اور قرآنیات کے مشہور عالم تھے۔ مخدوم شرف الدین بن یحییٰ منیری اُن سے ملنے گئے۔ پہلی ہی ملاقات میں اُن کو محسوس ہوا کہ بغیر مولانا کی قیادت کے اُن کے علم کی تکمیل ممکن نہیں ہے لہٰذا وہ بھی ذوق طلب میں مولانا کے ساتھ سنار گاؤں پہنچ گئے[۲] اور چند سال وہاں رہ کر فقہ اور حدیث میں مہارت حاصل کی منیر واپس آگئے۔ واپسی پر عشق الٰہی اتنا بڑھا کہ تصوف

---

[۱] ملاحظہ کیجیے، شیخ حسن سجزی، فوائد الفواد، لکھنؤ ۱۸۸۵ء صہ ۱۴۴

[۲] مناقب الاصفیاء۔ صہ ۱۳۱

کی طرف رغبت ہوئی اور پیر کی تلاش میں دہلی چلے گئے۔[۱]

فردوسی صوفیاء کے تذکرہ مناقب الاصفیاء میں مخدوم شرف الدین منیری سے متعلق بہت سی افسانوی روایات درج کر دی گئی ہیں[۲] جن سے مولف کا مقصد فردوسیوں کی چشتی صوفیاء پر فضیلت ثابت کرنا تھا۔ مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مخدوم دہلی پہنچ کر شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مذاکرہ جاری تھا جس میں انھوں نے شرکت کی اور اپنے علم سے شیخ نظام الدین اولیاء کو متاثر کیا۔ شیخ نے حکم دیا کہ اُن کو ایک طبق پان کے بیڑوں کا پیش کیا جائے اور یہ فرما کر رخصت کیا کہ یہ وہ سیمرغ ہیں جو میرے دام کا مقدر نہیں بن سکتے۔ وہاں سے وہ پانی پت پہنچے اور شیخ شرف الدین پانی پتی سے ملاقات کی۔ وہاں وہ اُن کی عظمت سے تو متاثر ہوئے لیکن ان کو اس قدر جذب میں پایا کہ اپنا پیر بنانا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنے بھائی کو بتایا کہ ان کی بزرگی میں کلام نہیں لیکن حالت ایسی ہے کہ وہ دوسروں کی خاطر خواہ تربیت نہیں کر پائیں گے۔ لہٰذا دہلی واپس آئے اور شیخ نجیب الدین فردوسی کے مریدین گئے۔ پیر نے چند ہی دنوں کے بعد خلافت نامہ دیا اور بہار واپس کر دیا۔ یہ شیخ نجیب الدین فردوسی کا آخری زمانہ تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[۳]

لیکن دہلی کے سفر اور وہاں اُن کے فردوسی سلسلے میں داخل ہونے کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ شیخ نے صوفیاء اور علماء کے صحیح حالات معلوم کرنے میں زیادہ کاوش سے کام لیا ہے۔ وہ معتبر مآخذ کو بھی احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہار میں شیخ شرف الدین منیری نے شیخ نظام الدین اولیاء کی شہرت سنی تو اس قدر متاثر ہوئے کہ بیعت کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے۔ لیکن اُن کے دہلی آنے سے پہلے شیخ نظام الدین اولیاء انتقال کر گئے تھے۔ دہلی میں دوسرے بزرگ شیخ نجیب الدین فردوسی بقید حیات تھے۔ جب وہ اُن کی خانقاہ میں پہنچے تو انھوں نے دیکھتے ہی کہا "درویش سالہاست کہ منتظر تو نشستہ ام۔ اِمّا امانتی دارم بتو سپردنی است" وہ ان کے مرید ہو گئے۔ پیر نے ان کو خلافت نامہ دے کر بہار کو واپس کر دیا۔ ابھی شیخ شرف الدین یحییٰ منیری راستہ ہی میں تھے کہ ان کے پیر کا بھی انتقال ہو گیا۔ لیکن پیر کی وصیت کے

۱؎ مناقب الاصفیاء، ص۱۳۱

۲؎ یہی حال سیر الاولیاء کا ہے جس میں چشتی صوفیاء سے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں موجود ہیں۔

۳؎ مناقب الاصفیاء، ص۱۳۲، ۱۳۳

مطابق انھوں نے سفر واپسی جاری رکھا۔[1]

بہار واپسی پر مخدوم نے کئی سال راجگیر کے نزدیک جنگل میں رہ کر مجاہدہ اور ریاضت میں صرف کیے۔ اس اثناء میں جمعہ کی نماز کے لیے شہر بہار (موجودہ بہار شریف جو کہ اس زمانہ میں ولایت بہار کا مرکز تھا) آجاتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں نے اُن کے مختصر قیام کے لیے چھپّر کی کی خانقاہ بنا دی تھی تاکہ جمعہ ہی کے دن لوگوں کو رشد و ہدایت دے سکیں۔

یہ سلطان محمد بن تغلق کا عہد تھا۔ سلطان کو جب اُن کی پاکبازی اور درویشی کا علم ہوا تو اس نے خطہ بہار کے والی (گورنر) مجد الملک کو بذریعہ فرمان حکم دیا کہ شیخ شرف الدینؒ کے لیے پختہ خانقاہ تعمیر کرائے اور راجگیر کے علاقہ کی آمدنی ان کی خانقاہ کے مصارف کے لیے مخصوص کردی جائے۔ سلطان نے تحفہ کے طور پر اُن کے لیے ایک بلغاری مصلیٰ بھی بھیجا۔ مزید براں والی کو یہ بھی لکھا تھا کہ اگر شیخ خانقاہ کے خرچ کے لیے روپیہ لینے میں تامل کریں تو اُن کو ہر طرح رضامند کیا جائے، مولف مناقب الاصفیاء کے مطابق چونکہ بادشاہ سخت مزاج تھا اس نے غصہ میں صوفیاء کو سخت سزائیں دی تھیں لہٰذا سرکاری مدد لینے سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لنگر چلانے اور غرباء میں تقسیم کے لیے روپیہ لیتے رہے لیکن سلطان محمد شاہ تغلق کے انتقال پر شاہی دربار سے ملنے والی رقم لینے سے انکار کردیا۔[2] لیکن واقعہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ دراصل شیخ شرف الدین منیری، سلاطین وقت سے تعلق رکھنے کے خلاف نہیں تھے۔ وہ اس تعلق کو خلقِ خدا کے حق میں سمجھتے تھے کیونکہ اس کی بنا پر وہ ضرورت مندوں کی اعانت کے سلسلے میں سلطان اور دوسرے ارباب حکومت سے جائز طریقے پر سفارش کرسکتے تھے۔ ہمارے بیان کی تصدیق ان کے ملفوظات سے ہوتی ہے جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا۔ لیکن سلطان فیروز شاہ سے قطع تعلق کی وجہ دوسری تھی جس کا ذکر اپنی ہی تالیف میں مولف مناقب الاصفیاء نے ایک دوسری جگہ کیا ہے۔ اصل میں سلطان فیروز شاہ پر علماء کا اس قدر اثر تھا کہ وہ حتی المقدور کوشش کرتا تھا کہ سلطنت میں خلاف شرع کوئی بات نہ ہوسکے۔ اسی عہد میں شیخ ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کا اثر اس قدر عام ہوگیا تھا کہ بہت سے صوفیاء اپنی خدائی کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید احمد بہاری اور شیخ عز کاکوی بہار سے دہلی آئے۔ انھوں نے دیوانگی (سکر) کے عالم میں توحید الٰہی کے سلسلے میں گفتگو شروع کی

---

[1] شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، دہلی ۱۲۸۳ھ صـ۱۱۳ [2] مناقب الاصفیہ صـ۱۳۴

علماء کو ان کے دعوؤں پر سخت اعتراض ہوا۔ سلطان نے محضر طلب کیا جس میں تمام علماء نے متفقہ طور پر ان دونوں کے قتل کا فتویٰ دیا۔ ان کے قتل سے شیخ اور سلطان کے مابین تعلقات خراب ہو گئے تھے[1] لیکن اس کے بعد شیخ شرف الدین کے تعلقات بنگال کے سلطان سے اس قدر خوش گوار ہے کہ وہ اس کی تربیت کے سلسلہ میں اس کو خطوط لکھتے رہے[2]

شہر بہار میں شیخ نے زندگی کے آخری چالیس سال رشد و ہدایت کے کام میں صرف کیے ان کا انتقال ۲ جنوری ۱۳۸۱ء میں ہوا اور بہار ہی میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی تعلیمات کا مطالعہ ان کے مکتوبات کی روشنی میں اچھی طرح کیا جاسکتا ہے ان مکتوبات کی پہلی جلد مکتوبات صدی اور دوسری جلد مکتوبات دو صدی کے نام سے مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں ۲۰۰ مکتوبات کی ایک تیسری جلد ملتی ہے، جس میں کچھ مکتبی باتیں ہیں جو شیخ نے اپنے عزیز مرید اور خلیفہ خاص مظفر بلخی کو لکھے تھے ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے بھی دستیاب ہیں جن میں معدن المعنی اور خوانِ پُر نعمت سے ان کی تعلیمات اور تبلیغی کاموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی تعلیمات اُن کی تصانیف کی روشنی میں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مکتوبات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہر زمانہ میں ان کا مطالعہ خواص میں ضروری سمجھا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی تعریف اپنی تالیف اخبار الاخیار میں کی ہے۔ ان کے حوالے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مکتوبات ربانی میں بھی ملتے ہیں۔ آئین اکبری میں ابوالفضل بتاتا ہے کہ مکتوبات صدی کے کچھ حصوں کو اس نے اکبر کو پڑھ کر سنایا تھا۔

خوانِ پر نعمت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شرف الدین منیری کی شہرت ہندوستان کے مختلف حصوں میں دور دور تک پھیل گئی تھی اور معرفت الٰہی کے دلدادہ اُن سے فیضیاب ہونے کے لیے دور دراز راستوں کا سفر طے کرکے بہار شہر آتے تھے۔ بیرون ممالک کے طلباء جن کا اژدہام دہلی میں رہتا تھا اُن میں بھی جو تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے وہ بھی شیخ کی زیارت کے لیے بہار کا سفر کرتے تھے۔ لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ شیخ کا اثر صرف بہار کے علاقہ میں محدود تھا۔ زائرین کے نام

---

[1] ایضاً ص ۱۳۰۔ سلطان فیروز شاہ کے مطابق شیخ احمد بہاری کے مرید اس کو خدا کہتے تھے۔ ملاحظہ ہو فتوحاتِ فیروز شاہی، رضوی پریس دہلی، ۱۳۰۲ھ ص ۶

[2] شیخ مظفر بلخی، مکتوبات، خدابخش لائبریری مخطوطہ، ــــ ورق۔

اور شیخ کی اُن سے گفتگو شیخ کے عالم مرید شیخ زین بدر عربی نے قلم بند کر کے ملفوظات کی شکل میں شائع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مولف کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ملفوظات کے ان مجموعوں میں صرف مذہبی اور روحانی امور ہی قلم بند کیے گئے ہیں یہ ملفوظات پڑھے لکھے زائرین کے سوالات کے جوابات تھے اس کے برعکس عوام سے جو گفتگو ہوتی تھی وہ ان کے ذاتی معاشی اور دوسرے سماجی مسائل سے متعلق ہوتی تھیں ان سے شیخ زین بدر کو دلچسپی نہیں تھی لہٰذا شیخ کے عوام سے فرمودات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ نتیجہ میں ہم کو بہار کے عوام کے مسائل کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا کہ وہ شیخ کی خانقاہ میں کس طرح کے مسائل لے کر حاضر ہوتے تھے۔ برخلاف ان ملفوظات کے مجموعوں کے چشتی صوفیاء کی ملفوظات 'فوائد الفواد' 'خیر المجالس' 'جوامع الکلم' وغیرہ میں تاریخی اہمیت کا مواد ملتا ہے اس سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے حالات زندگی اور اُن کو درپیش مسائل پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ ان مجموعوں میں ہمیں خاص کر عہد وسطیٰ کے مسلم معاشرہ کی بڑی اچھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دن سلطان فیروز شاہ کے ابتدائی دور میں زائرین سے گفتگو کے دوران شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے بتایا کہ سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) کے عہد میں اس قدر خوش حالی تھی کہ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ "سردیوں کے موسم میں ایک مفلس گدا بھی بغیر لحاف کے نہیں رہتا تھا۔ بلکہ ہر فقیر کے پاس کئی لحاف ہوتے تھے۔ ایک تنکہ میں پشمینہ (یعنی شال) دو تنکہ یا بیس جیتل میں دھاری دار پشمینہ، تیس جیتل عمدہ مکینہ کپڑے کے لحاف کے اوپری حصہ اور صرف بارہ جیتل اس کے نچلے استر، اور روئی کے لیے کافی تھے۔ صرف چار جیتل بھرائی اور بھرائی اور سلائی پر خرچ ہوتے تھے۔ آج کل روئی کی بھرائی (نداف کی اُجرت) اور سلائی پر ایک تنکہ (چاندی کا سکہ) خرچ ہوتا ہے"۔ مزید اس کے فوراً بعد ایک ماضی کے امیر کے متعلق تعریفاً کہا: اُس زمانہ میں کافور مہر دار ہر سال فقراء میں اس قدر لحاف بانٹتا تھا کہ ایک فقیر دو مرتبہ لحاف لے گیا[1]۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوانِ پُرنعمت تاریخی اہمیت کے مواد سے بالکل خالی ہے کبھی کبھی شیخ مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے اہم واقعات کا حوالہ بھی دیتے ہیں اس طرح ہمیں ان واقعات کی تاریخی شہادت فراہم ہو جاتی ہے۔ مثلاً سلطنت دہلی کے وجود میں آنے کے بعد تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں مسلم سلاطین نے بہت سے شہر تعمیر کرائے اور ان شہروں

---

[1] حمید قلندر، خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۴۰، ۲۱۴

میں علماء اور فقہا بسائے گئے تاکہ وہ نئے شہر اسلامی علوم اور تہذیب کے مراکز بن سکیں اور ان کے ذریعہ اسلامی اثرات دور دور تک پھیل سکیں۔ خوانِ پُرنعمت میں بہت سے شہروں اور قصبوں کا ذکر ملتا ہے۔ ہر جگہ حکومت نے ایسے حالات پیدا کئے تھے کہ وہاں علماء و فضلا، بآسانی قیام کر کے لوگوں کی تعلیمی ضروریات پوری کر سکیں اور ان کی مذہبی رہنمائی بھی ہوتی رہے۔ چودھویں صدی میں بنگال میں لکھنوتی کے علاوہ سنارگاؤں (موجودہ ڈھاکہ کے نزدیک) اسلامی ثقافت اور علوم کا دوسرا اہم مرکز بن گیا تھا۔ وہاں بخارا کے علماء خاصی تعداد میں تھے اور ان کو حدیث، فقہ اور تفسیر پر دسترس حاصل تھی[1]

ملفوظات کے مطالعہ سے مسلم معاشرہ پر غیر اسلامی اثرات کا بھی خاطر خواہ اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دن قاضی اشرف الدین نے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ نے کتنی بار صلوٰۃ معکوس[2] ادا کی اور آیا کہ آپ نے اس کو درویشانہ ورزش کے طور پر کیا تھا یا کوئی دوسرا مقصد تھا جواب میں شیخ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بار ادا کی تھی اور مقصد عشق الٰہی تھا "صوفیا سنت رسول اللہ ادا کرنے کے مقصد سے اس کو روا رکھتے ہیں۔ فادر ڈاکٹر پال جیکسن کا جنھوں نے خوانِ پرنعمت کا انگریزی زبان میں بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے[3] خیال ہے کہ اس بیان سے چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے صوفیا پر ہندو یوگیوں (جن کو عہد وسطیٰ کی کتابوں میں جوگی کہا گیا ہے) کے اثر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور ایک راسخ العقیدہ عرب مسلمان کو جو کہ ہندوستانی مسلمانوں کی روحانی روایات سے ناواقف ہے اس کو شیخ کے اس بیان سے شدید اختلاف ہوگا۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت سے شیخ شرف الدین منیری بخوبی واقف تھے[4]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تیرہویں اور چودھویں صدی کے صوفیا پر ہندوستانی اثرات کا براہِ راست اثر معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن سلطنت دہلی کے قیام سے صدیوں پہلے وسط ایشیا میں صوفیاء پر بدھ مذہب کے پیروؤں کا کافی اثر پڑا تھا۔ بہت سی ہندوستانی روایات بدھ مذہب کے ذریعہ

---

[1] شیخ زین بدر، خوانِ پُرنعمت، انگریزی ترجمہ پال جیکسن، دہلی، ۱۹۸۶ء صہ ۱۰۵۔ فادر پال جیکسن نے ملفوظات کا فارسی سے انگریزی زبان میں بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ہم نے فارسی متن کے ساتھ ساتھ اس ترجمہ کو استعمال کیا ہے کیونکہ اکثر حاشیہ میں مترجم کا تبصرہ بصیرت افروز ہے۔ [2] صوفیاء نے یوگیوں کی ایک خاص ورزش کو صلوٰۃ معکوس کا نام دیا ہے۔ اس میں آدمی کنویں یا پیڑ سے الٹا لٹک کر جس دم کر کے ذکر الٰہی کرتا تھا اس کے لیے جس دم اور پاسِ انفاس کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے [3] خوانِ پُرنعمت۔ مترجم پال جیکسن، ادارہ۔ دہلی

صوفیاء میں رائج ہوگئی تھیں۔ وسط ایشیا کے لوگ اسلام کی فتح سے پہلے بدھ مذہب کو مانتے تھے اسی وسط ایشیا سے ہندوستان میں فاتح اور صوفی دونوں آئے اُن کے ساتھ سلوک سے متعلق روایات بھی آئیں۔ اس سلسلے میں شیخ شرف الدین کی معلومات کا ماخذ شیخ نظام الدین اولیاء کی ملفوظات فوائد الفواد معلوم ہوتی ہے۔ فوائد الفواد میں آیا ہے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر صلوٰۃ معکوس ادا کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اسی کے ذریعہ ان کو روحانی فیض حاصل ہوا تھا۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر اس کو سنتِ رسول اللہ سمجھ کر صلوٰۃ مصطفیٰ کہتے تھے[۱]

فوائد الفواد کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء کو اسے سنت ماننے میں تامل تھا اور وہ اس کی ادائیگی کو ضروری بھی نہیں سمجھتے تھے[۲] لیکن شیخ شرف الدین منیری بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ وہ ہر اُس بات کو من وعن مان لیتے تھے جو کہ ان بزرگوں سے منسوب ہوتی تھی بشرطیکہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔

چند باتوں کو چھوڑ کر زیادہ تر شیخ شرف الدین منیری کی تعلیمات قرآن اور سنت کے مطابق تھیں۔ اُن کی تصانیف اور ملفوظات سے اُن کے تبحر علمی اور شریعت کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ ہر اُس بات کے خلاف تھے جو قرآن کے تصور توحید سے ٹکراتی ہو۔ وہ اعتدال پسند بھی تھے۔ سختی کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دین کو اس طرح پیش کیا جانا چاہیئے کہ وہ انسان کی اصلاح اور آسانی دونوں کا ذریعہ بنے۔ وہ ہمیشہ اُن علماء کے طرفدار رہے جو کہ انسانی مسائل کے حل کے سلسلے میں سہولت کو مدِ نظر رکھ کر فتویٰ دیتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے سنار گاؤں کے زمانہ قیام میں مسلمانوں میں چونے کے استعمال پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ چونے کا پان کے ساتھ استعمال ہوتا تھا اور چونا صدف سے بنایا جاتا تھا۔ لوگوں کو اعتراض تھا کہ صدف کا استعمال جائز نہیں ہے۔ لیکن معتدل مزاج علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہزاروں لوگ جو چونا کھانے کے عادی ہو گئے تھے وہ مشکل میں پڑ جاتے اور جو اس کا استعمال کرتے وہ حرام چیزوں کا استعمال کرنے والے متصور ہوتے۔ شیخ نے فتویٰ کی تعریف کرتے ہوئے مریدوں کو بتایا کہ "راہِ اسلام بہت کشادہ ہے، جس چیز سے لوگوں کو دشواری پیش آئے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ قرآن اس کی ممانعت نہ کرتا ہو"[۳]

ایک جگہ مسلمانوں اور خلقِ خدا کی خدمت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک دن

---

[۱] فوائد الفواد صد ۷ [۲] خوانِ پُر نعمت، مطبوعہ پٹنہ، ۱۳۲۱ھ، صد ۲

شیخ صدرالدین عارف (بن شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ) کی خانقاہ میں لوگوں نے شیخ صدرالدین عارف سے اُن کے مرید ممّن ملتانی کی تعریف کی کہ وہ مسلمانوں کی خدمت بڑے شوق سے کرتے تھے۔ شیخ عارف نے خوش ہوکر جواب دیا کہ اس خدمت کا سو رکعت نمازوں اور سو روزوں سے زیادہ ثواب ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کی اعانت کرنا اور مخلوق خدا کی خدمت ایک اچھی عبادت ہے۔ یہی پیغمبروں کا اسوہ تھا۔

خوانِ پرنعمت میں کچھ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جن سے مسلم عہد حکومت میں سلاطین وقت اور امرا کی سرپرستی میں فنون لطیفہ کی ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے مندروں اور راجاؤں کے محلات میں دیواروں کی سجاوٹ کے لیے رنگوں سے انسانوں، جانوروں اور پیڑ پودوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ مسلمانوں نے اس فن کو زیادہ ترقی دی۔ سلطان التمش کے عہد میں نقش گرانِ چین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھوں نے دہلی میں شاہی محلات کو اپنی مصوری کے ذریعہ سجایا[1]۔ خوان پُرنعمت، سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ پر مصوری کا بھی رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا[2]۔ واضح رہے کہ کاغذ بنانے کی صنعت کا ہندوستان میں مسلمانوں کے ذریعہ فروغ ہوا۔

کچھ حوالوں سے شیخ شرف الدین منیری کے حالات زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ وہ سلوک کی منازل طے کر رہے تھے تو تن تنہا راجگیر کے جنگل میں رہتے تھے۔ اور ریاضت اور مجاہدہ میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ ہفتہ میں جمعہ کے دن نماز کی غرض سے بہار شہر آجاتے تھے وہاں پر لوگ اُن سے ملتے تھے۔ بڑھاپے میں جب خانقاہ میں رہنے لگے تو ایک دن مریدوں کو بتایا کہ جب وہ راجگیر کے جنگل میں ایک کہنہ غار میں رہتے تھے، اس زمانہ میں خطہ بہار کا والی ایک سخت گیر افسر تھا وہ لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا۔ لیکن شیخ کا احترام کرتا تھا۔ لوگ اُس سے اپنی شفاعت کرانے کے لیے جمعہ کے دن شیخ سے ملتے تھے اور والی کے لیے سفارشی خطوط لکھواتے تھے۔ وہ ہر ضرورت مند کے لیے سفارشی خط لکھ دیتے تھے۔ لوگوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی شیخ گھبرا جاتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لوگوں سے غصہ بھی ہوجاتے تھے۔ ایک دن شیخ زادہ چشت جو کہ دہلی میں اُن کی شہرت سُن کر اُن سے ملاقات کے لیے بہار آئے

---

[1] عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء صـ

[2] خوان پُرنعمت، ترجمہ پال جیکسن، صـ ۳۲ فنون لطیفہ کی شرعی حیثیت یہاں زیر بحث نہیں ہے۔

ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ جب اُنھوں نے شیخ کو غصہ میں دیکھا تو شیخ سے کہا۔ آپ پریشان ہو کر ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ لوگوں کی مصیبتوں کو اپنے اوپر لیجیئے[1] اندازہ ہوتا ہے کہ اس بات کا شیخ پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ خدمت خلق کے پہلے سے زیادہ قائل ہو گئے۔

شیخ شرف الدین منیری کے نزدیک صوفیا، کا کرامت کو ظاہر کرنا شعبدہ بازی کے مترادف تھا۔ وہ اس کو روحانی قدروں کے منافی سمجھتے تھے۔ لیکن اُن صوفیا، کو معذور سمجھتے تھے جن سے مافوق العادت حرکتیں سکر یا جذب کی حالت میں سرزد ہو جاتی تھیں۔ شیخ شرف الدین منیری فرماتے تھے کہ ہر پاکباز صوفی کا فرض ہے کہ وہ اپنی روحانی صلاحیت و کمال کو پوشیدہ رکھے اور وضاحت کے لیے مزید فرماتے تھے اور اُن کے انتقال کے بعد بیہودہ اور کج فہم مریدوں اور درگاہ کے مجاوروں نے اُن کی کرامات سے متعلق افسانے گھڑ کر مشہور کر دیئے۔ بعض نے تو اس ضمن میں کتابیں بھی شائع کیں جن میں غلط باتوں کو مشائخ کی طرف منسوب کیا۔[2]

شیخ شرف الدین منیری کو تاریخ اسلام سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ مشاہیر اسلام کے متعلق رائے دینے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ وہ حضرت علی حیدرؓ اور امیر معاویہؓ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دونوں کے باہمی اختلافات کو اُن کا ذاتی معاملہ اور مذہب سے علیٰحدہ سمجھتے تھے۔ اُن کے مابین جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ ان سے آیندہ زمانہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اہم مسائل کا حل نکل آیا تھا مثلاً نماز جمعہ اور خطبے کے احکام واضح ہوتے۔[3] ایک مرتبہ شیخ زین بدر عربی نے پوچھا کہ یزید بن معاویہ پر لعن طعن کیوں نہیں کرنی چاہیئے۔ شیخ نے فرمایا کہ ایک کمتر آدمی کو اپنے سے برتر آدمی کی مذمت نہیں کرنی چاہیئے۔ یزید صحابی کا مرتبہ رکھتے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ اول تابعین کی حیثیت سے قابلِ احترام تھے۔ اور پھر رسول کریمؐ کا قول نقل کیا: میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ میرے صحابیوں کے مابین اختلافات اور تنازعہ کو معاف کرنا۔[4] دراصل شیخ کا رویہ وہی تھا جو اس معاملہ میں ثقہ اہلِ تسنن علماء کرام کا ہمیشہ رہا ہے۔ یقیناً ان کی ان تعلیمات سے تفصیلی رجحانات کا جو کہ دوسرے صوفیاء کے اثر سے بڑھ رہے تھے، سدباب ہوا۔ کم از کم شیخ کے معتقدین کے یہاں

---

[1] خوانِ پرنعمت، انگریزی ترجمہ۔ صـ۵۷ [2] ایضاً صـ۱۰۱

[3] خوانِ پرنعمت، فارسی متن۔ صـ۶۵

یہ رجحانات نہیں پائے جا سکتے تھے۔ فادر پال جیکسن لکھتے ہیں کہ یزید کے معاملہ میں شیخ کا رویہ اُن کے اپنے تصورحیات سے مطابقت رکھتا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ آدمی کو اپنے دشمن کا بھی بہی خواہ ہونا چاہئے۔[1]

۳۷ ویں مجلس میں شیخ نے شیخ عثمان ہرونی کی وصفی ملفوظات کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے عہد میں چشتی بزرگوں سے منسوب وصفی ملفوظات خواص میں بھی قبولیت عام حاصل کر چکی تھیں۔ اور وہ اُن کو جعلی اور غیر معتبر نہیں سمجھتے تھے۔[2] حالانکہ شیخ نظام الدین اولیاء شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور سید محمد گیسو دراز نے ان کو جعلی قرار دے دیا تھا۔[3] لیکن ان ملفوظات میں بھی ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے جو قرآن مجید سنت سے ٹکراتی تھیں۔ اس معاملہ میں وہ اُن بزرگوں کا بھی اتباع نہیں کرتے تھے جن کی بزرگی اور روحانی کمالات کے وہ معترف تھے۔ مثال کے طور پر وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کر کے اُن کا تبحر بھی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ابن العربی کی اندھی تقلید کے قائل نہیں تھے۔ ان کے مکتوبات صدی اور خوانِ پرنعمت دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ابن العربی کے فلسفۂ وحدت الوجود سے پوری طرح متفق نہیں تھے۔ وہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ وراء الورا ہے اور قادر مطلق ہے وحدت الوجود کا فلسفہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شیخ شرف الدین منیری مکتوبات صدی میں اور خوانِ پرنعمت دونوں میں فرماتے ہیں کہ انسان اور باری تعالیٰ کسی صورت میں ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتے اور ماضی کے صوفیاء کی رائے کا حوالہ دیتے ہیں کہ عظیم صوفیاء کے مطابق سلوک کی چوتھی منزل سالک کو ایسے نور الٰہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ جس کی تابناکی کی وجہ سے ہر شئے اپنی تابناکی کھو دیتی ہے اور وہ اس نور کا حصہ معلوم ہونے لگتی ہے یہ ایسا ہے جیسا کہ سورج کے نکلنے پر اس کی تابناکی روشنی میں ہر چمکنے والی شئے ماند پڑ آتی ہے کیونکہ سورج کی روشنی اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس شئے کی روشنی کی حقیقت سورج کے غروب ہونے تک بے معنی ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے نور کی بے پناہ تابناکی کی وجہ سے سالک کو ہر شئے نور خداوندی ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہے لیکن

---

[1] ایضاً ص۹۰ حاشیہ ۸۰ [2] ایضاً ص۱۲۵

[3] ملاحظہ کیجئے خیر المجالس ص۵۲ اور جوامع الکلم، کانپور، ۱۳۵۶ھ ص۱۲۴

حقیقت میں اس کے وجود کے نورِ الٰہی میں ضم ہونے یا اس کی اپنی انفرادیت کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۱]

شیخ شرف الدین منیری کے برخلاف اُن کے چشتی ہمعصر صوفی بزرگ، سید محمد گیسو دراز ابن العربی کے افکار کے سخت مخالف تھے۔ وہ ابن العربی کی تعلیمات کو گمراہ کن تصور کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "اگر وہ (ابن العربی) میرے زمانہ میں زندہ ہوتے، میں ان کو اللہ تعالیٰ کے وراءالوراء ہونے کا قائل بناتا اور اُن کو عالمِ روحانیت کی سیر کے ذریعہ ان کے اسلامی عقیدہ کو دوبارہ زندگی دیکر ان کو مسلمان بنالیتا۔"[۲]

شیخ شرف الدین منیری نے ۵۶ سال تک بحیثیت صوفی کے عوام وخواص میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیا اور مذہبی زندگی کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کا درس دیا۔ لوگوں کو ان کے خلوص تقویٰ، دینداری اور خدمتِ خلق کے جذبہ سے متاثر ہو کر لوگ اُن سے فیضیاب ہونے کے لیے دور دراز کا سفر طے کرکے بہار شہر آتے رہے۔ اُن کی ایمان افروز تعلیمات سے مسلمانوں ہی کے خواص وعوام متاثر نہیں ہوئے بلکہ بہت سے ہندو بھی ان کی خانقاہ میں آتے تھے۔ بہت سے اُن کی صحبت میں اسلام سے متاثر ہو کر اُن کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ شیخ کے خلیفہ اول مظفر بلخی فرمایا کرتے تھے کہ اُن کے پیر نے جن ہندوؤں کو مسلمان بنایا وہ سب صاحبِ یقین مسلمان بنے جس طرح کہ ماضی میں دوسرے عظیم بزرگوں کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہونے والے لوگ ہوتے تھے۔[۳] یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صوفیاء کی خانقاہوں میں ہندو عقیدت مند آتے تھے اور اُن میں سے جو اسلام کی طرف مائل ہو کر اور مسلمان بننے کی خواہش ظاہر کرتے تھے اُن کو شیخ بخوشی مسلمان بناتے تھے لیکن وہ اس سلسلے میں ہر کسی کے مسلمان بننے پر اصرار نہیں کرتے تھے ان کا حسن سلوک ہر آدمی کے ساتھ یکساں تھا لہٰذا خانقاہوں میں انھیں افراد کو مسلمان بنایا جاتا تھا جن کو اسلام کی صداقت کا یقین ہو جاتا تھا۔ یہی حال درگاہوں کا تھا کہ وہ بعض اوقات ہندو عقیدت مند منّت کے پورا ہونے پر مسلمان ہو جاتے تھے۔ جہاں تک پسماندہ ذات کے لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے

۱۔ مکتوبات یک صدی، انگریزی ترجمہ، پال جیکسن، بمبئی ۱۹۸۵ء مکتوبات ۱، ص ۱۳ نیز ص ۴۲۵۔ جہاں حاشیہ ۴ میں مترجم نے شیخ کے تصورِ توحید پر تبصرہ کیا ہے۔

۲۔ سید محمد گیسو دراز، خاتمہ بمطابق خسرو حسینی، شہود وجود، گیسو دراز کا مطالعہ، اسلامک کلچر، انگریزی جریدہ، حیدرآباد دکن، جلد ۳۹، ۴ء، اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۲۹۸

۳۔ مناقب الاصفیہ، ص ۱۴۱

کا معاملہ ہے تو اُن کے لیے دوسرے سماجی ادارے جیسے کارخانے، مدرسے اور شہروں میں مذہبی مسلمانوں کا حسنِ سلوک سب تھے۔ شہروں اور قصبوں میں پوری پوری ذاتیں مشرف بہ اسلام ہوگئیں۔ تاہم صوفیا کرام کا سوشل رول بھی اہم رہا ہے۔

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ ۱۳۷۱ء میں انتقال فرمایا۔ ان کی روایات کو ان کے خلفا نے قائم رکھا۔ خلفا میں شیخ مظفر بلخی سب سے نمایاں تھے۔ اپنے پیر کے مکتوبات کی طرح ان کے مکتوبات بھی قرونِ وسطیٰ کے علمی حلقوں میں مقبول رہے ہیں۔[1]

---

[1] مزید حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت ج ۳ ص ۳۳۲، ۳۳۳